© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی علمیت بمقابلہ سائنسی جدیدیت

ڈاکٹر ابصار احمد

جمہور علمائے ربانی اور متکلمین سلف کے نزدیک جہاں ایک طرف اسلام اور اس کے اوامر و نواہی اپنی ساخت اور بناوٹ میں اور اسلامی نظامِ حیات (یعنی شریعت) فی نفسہ معقول المعنی تصور کیا گیا ہے‘ اس کے مسائل واحکام میں تعلیل و مصالح کے مضمرات نفوسِ مزکی کو ہمیشہ نظر آئے ہیں‘ وہاں دوسری طرف اسی عقل و فہم کو حقیقی اور مصدقہ (authentic) سمجھا گیا جو قرآن وسنت سے مستفاد و محصور ہے۔ جس کی بنیاد خدا شعوری‘ احساسِ بندگی‘ تقویٰ اور آخرت طلبی ہے اور جو اپنی محدودیت سے آگاہ ہے۔ دراصل قرآن کی الٰہیاتی علمیات کے مطابق منزل من اللہ حقائق کا فہم ہی اصل تعقل‘ تفکر‘ تذکّر اور علم و فہم کے در وا کرتا ہے۔ قرآن کریم نے جا بجا اس امر کی صراحت کی ہے کہ وحی الٰہی کی غرضِ تنزیل ہی یہ ہے کہ لوگ عقل و فکر سے کام لیں۔ یعنی قرآن وسنت کے بیان کردہ حقائق و معارف کا گہرا شعور اور فہم ہی حقیقی تعقّل و تفکّر اور تدبّر ہے جو مبدأ و معاد کی گتھیاں حل کرتا ہے۔

اسلامی عقائد و تعلیمات کی داخلی نورانیت اور حکمت ہی کے باعث اسلام کے دفاع کے لیے متکلمین گروہ در گروہ سامنے آئے اور اس کے معارف و حکم پر تصانیف قلمبند کیں۔ غزالی‘ عزالدین بن عبدالسلام اشعری‘ خطابا‘ ابن تیمیہ‘ حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر علمائے اسلام نے عقائد کے مباحث سلجھائے اور عبادات کے اسرار و رموز واضح کیے۔ علوم القرآن‘ علوم الحدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ الٰہیات اور فکر و فلسفہ میں متذکرہ بالا اور ان کے پائے کے بیسیوں دوسرے مشاہیر اسلام نے ہمارے دین اور تہذیب کی اسلافی روایت کی بنیادیں بالوضاحت قائم کی ہیں۔ جن میں ایک طرف علمیات‘ اخلاقیات‘ معاشرت و معیشت اور جملہ مابعد الطبیعیاتی مباحث پر قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی تعلیمات انتہائی حکیمانہ اور بصیرت افروز انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ اور دوسری طرف الحاد و زندقہ اور گمراہ فرقوں کے خیالات پر چشم کشا نقد و تبصرہ ہے۔ الغرض اسلامی علمیت کی تشکیل‘ ایمان‘ تقویٰ‘ تدین اور روایت کے حوالوں سے ہوتی ہے جو قطعی و حتمی ایقان فراہم کر کے نہ صرف ذہنی و قلبی آسودگی عطا کرتی ہے بلکہ اخروی نجات اور فوز و فلاح کی ضامن بھی ہے۔

بدقسمتی سے یورپ میں برپا ہونے والی تحریک نشاۃ ثانیہ اور جدیدیت (modernity) نے وحی الٰہی پر مبنی مذہبی علمیت پر کاری ضرب لگائی۔ فکری سطح پر جدیدیت کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کا مغربی استعمار کے تحت آنا اور اب حالیہ گلوبلائزیشن نے ہمارے ہاں کے اچھے خاصے دینی ذوق رکھنے والے تعلیم یافتہ حضرات اور یونیورسٹی اکیڈیمیا کو بھی متاثر کیا۔ اور انہوں نے سائنٹفک ورلڈ ویو یا بالفاظ دیگر ’سیکولرزم‘ کو علمی طور پر قبول کرتے ہوئے قرآن و حدیث کی ہر طرح کی تعبیری تراش خراش کی۔ اور اس طرح دین متین متجددین کی فکری تاخت کا نشانہ بنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دینی اباحیت پسندی نام نہاد روشن خیالی‘ آزادروی اور انکارِ شریعت کی صورت میں سامنے آئی۔ اس کا شکار بعض وہ دانشور بھی ہوئے جن کی ابتدائی تعلیم وتربیت نہ صرف دینی ماحول میں ہوئی تھی بلکہ وہ جامد مذہب سے آگے اسلام کے تحریکی تصور سے بھی واقفیت رکھتے تھے‘ جس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں کا اہم رول رہا ہے۔ اسی قسم کی ایک کیس سٹڈی پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد کے جدیدیت کے زیر اثر اسلامی عقائد اور شرعی احکامات کی تاویلاتِ جدیدہ ہیں جن پر علمی محاکمہ نوجوان مصنف محمد ظفر اقبال نے حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ’’اسلام اور جدیدیت کی کشمکش‘‘ میں کیا ہے۔ راقم نے اس کتاب پر تعارفی اور تبصراتی مقالہ بعنوان ’’اے روشنی طبع تو برمن بلاشدی‘‘ ماہنامہ میثاق بابت جولائی ۲۰۱۵ء میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر منظور صاحب کا تفصیلی تذکرہ اور صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن برادر بزرگ ڈاکٹر اسرار احمد ؒ سے ان کے تعلق کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ قارئین کے لیے ان کا ابتدائی مختصر تعارف یہ ہے: پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد شعبہ فلسفہ کراچی یونیورسٹی میں صدر شعبہ اور فیکلٹی ڈین تھے۔ بعدازاں وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی‘ ریکٹر اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد اور ممبر اسلامی نظریاتی کونسل رہے۔ گزشتہ لگ بھگ پندرہ سال سے کراچی میں عثمان انسٹیٹیوٹ کے صدر نشین ہیں۔ آپ نے ٹیلی ویژن پر علمی موضوعات کے مذاکروں میں کئی برس شرکت کی اور دانشور کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اب خرابیٔ صحت اور پیرانہ سالی کے باعث زیادہ فعال نہیں ہیں۔

کراچی میں بی اے اور ایم اے کی تعلیم اور بعدازاں ملازمت کے دوران ڈاکٹر منظور صاحب کا تعلق اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت کی مرکزی ٹیم سے رہا ہے۔ ان کے احباب میں پروفیسر خورشید احمد صاحب‘ ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری‘ مرحوم خرم مراد‘ برادر مکرم اسرار احمد مرحوم‘ قاضی عبدالقادر صاحب‘ ڈاکٹر انیس احمد اور دوسرے اہم اور تحریکی طور پر فعال لوگ رہے ہیں۔ منظور صاحب کا ذاتی طور پر میں احسان مند ہوں کہ جب میں نے اسرار بھائی کی خواہش پر منٹگمری (حال ساہیوال) سے migration کر کے 1963ء میں شعبہ فلسفہ کراچی یونیورسٹی میں داخلے کا ارادہ کیا تو منظور صاحب نے مجھے شعبے کے اساتذہ سے متعارف کروایا‘ جن میں خاص طور پر صدر شعبہ ڈاکٹر محمد محمود احمد‘ انصاری صاحب‘ انیس احمد صاحب اور اکرام علی صاحب تھے۔ وہ خود چند دن بعد لندن ڈاکٹریٹ کے لیے روانہ ہو گئے‘ اس لیے مجھے کبھی ان کا باقاعدہ سٹوڈنٹ ہونے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ چونکہ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے BA کے پہلے سال کا امتحان فرسٹ ڈویژن اور فلسفے کے مضمون کے ساتھ کیا ہوا تھا‘ اس لیے میں نے آنرز دو سال میں (یعنی 1965ء میں) اور اگلے سال ایم اے کر لیا۔ آرٹس فیکلٹی میں ایم اے میں پہلی پوزیشن لینے پر مجھے حکومت پاکستان کی طرف سے میرٹ سکالرشپ ملا جو میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے سائیکالوجی کا ایک سال پڑھنے کے بعد avail کیا۔ کراچی سے اکتوبر 1967ء میں لندن روانہ ہوتے ہوئے بڑے بھائی مرحوم اقتدار احمد صاحب نے عزیز و اقارب اور احباب کے لیے ہوٹل فاروق میں الوداعیہ کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں بھی ڈاکٹر منظور احمد‘ جو ایک سال قبل ڈاکٹریٹ مکمل کر کے کراچی یونیورسٹی واپس آ چکے تھے‘ میری درخواست پر تشریف لائے۔ اور مجھے تعلیمی ہدایات کے علاوہ ہیتھرو ایئرپورٹ سے سنٹرل لندن پہنچنے اور پھر ہائی کمیشن سے سکالرشپ کی رقم کے حصول‘ اور پاکستان سٹوڈنٹس ہاسٹل کے ایڈریس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بارے میں بہت مفید tips دیئے جو میرے بہت کام آئے۔

لندن روانگی سے قبل منظور صاحب باریش تھے' لیکن تین سال بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ساتھ واپسی پر چہرہ اس سنت سے ''صاف'' تھا۔ آنکھوں کی تیزی' چال ڈھال اور اندازِ گفتگو سبھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ بربیک کالج لندن میں پروفیسر ہیملن (Prof Hamlyn) کی نگرانی میں کام کیا اور Concept of Sense Data پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ بادیٔ النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گہرائی میں اتر کر کسی substantive ایشو پر تحقیقی کام نہیں کیا۔ گمان غالب یہ ہے کہ زیادہ وقت Bloomsbury Group کے مماثل لوگوں کے ساتھ میل جول رہا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ آپ کی رہائش ہمیسٹڈ ہیتھ (Hempsted) جیسے علاقے میں رہی جہاں میرے خیال میں کوئی مسجد بھی اس وقت نہیں تھی اور آبادی بالعموم کلچرل ایلیٹ پر مشتمل تھی۔ پروفیسر ہیملن ہی کے تحت بعدازاں پروفیسر اکرام علی صاحب نے Problem of Time پر ریسرچ کی اور (بقول ان کے) انہوں نے ہیملن کو تاریخ فلسفہ سے بالکل نابلد پایا۔ گویا شاگرد نے استاد کو پڑھایا۔ انگلستان میں اس وقت زیادہ تر اساتذۂ فلسفہ لسانی تحلیلی فلسفے کے منہاج میں دلچسپی لیتے تھے اور modernity کے اصول وضوابط' ذہنی افق اور انسان مرکزی منہاجِ علم بالعموم ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ جدیدیت پر مبنی ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا mind-set اسی دور کی legacy معلوم ہوتا ہے جسے انہوں نے دینِ حق کی تفہیم میں بھی استعمال کر کے زبردست ٹھوکریں کھائیں' جو محمد ظفر اقبال صاحب نے بالتفصیل واضح کی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالعموم خاص مذہبی عربی اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ کر کے اس کا مفہوم متعین فرما لیتے ہیں' اور پھر اس پر اپنے خیالات وافکار کی عمارت تعمیر کر لیتے ہیں۔ حالانکہ استعمال کی گئی صرف اصطلاح اسلامی ہوتی ہے اور اس کا مفہوم منظور احمد کا خود معین کردہ ہوتا ہے' جو بالعموم اسلام کی چودہ سو سالہ علمی و مابعد الطبیعی روایت کے منافی ہوتا ہے۔ ''اسلام چند فکری مسائل'' میں 'اجتہاد' اور 'مقاصد الشریعۃ' کے حوالے سے کی گئی گفتگو یہی ثابت کرتی ہے............

متعلقہ موضوعات پر عربی میں تصنیف شدہ کتابوں کے مطالعے سے محرومی' دین کے اساسی وقانونی اور مابعد الطبیعی حقائق ومسائل کو مغربی فکر وفلسفے کی روشنی میں پڑھنے اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کو ''نتیجہ خیز'' سمجھنے' اور عاجلانہ نتائج نے ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے مطبوعہ مضامین ومقالات میں عجیب قسم کا ابہام وتضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے وہ مسائل جن پر ڈاکٹر صاحب نے قلم اٹھایا ہے اس پر ان کا اپنا ذہن صاف اور واضح نہیں ہے اور وہ صورت مسئلہ کے درست فہم سے قاصر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی' بادیٔ النظر میں' دلکش پیرائے میں لکھی گئی تحریریں' بجائے تشکیک اور شبہات کم کرنے کے اسے اور بڑھا دیتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں جدید مسائل کے حل کی فکری رہنمائی تو دور کی بات ہے' بعض اوقات خود دین ومذہب ہی واہمہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتہائی نازک' حساس' علمی اور فکری مبحث میں بغیر تیاری کے ہاتھ ڈال دیا گیا ہے۔

فلسفے کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ہر شے کو سوالات کی تلوار پر رکھ لیتا ہے' لیکن اس کا مؤثر اور قطعی جواب فراہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کرتا۔ شک کا دروازہ کھول دیتا ہے مگر اسے بند نہیں کرتا۔ فلسفہ کھلے ذہن کا ثمر ہے‘ یعنی فلسفی ایک ایسا آدمی ہے جس کا منہ ہمیشہ کھلا رہے۔ سوالات کرنا اور اعتراض اٹھانا ہی اس کا کام اور اس کی پہچان ہے۔

> *Philosophy questions everything and settles nothing, some reassurance may be found in the words of the late English journalist-critic G.K. Chesterton, who remarked, "Merely having an open mind is nothing. The object of opening the mind, as of opening the mouth, is to shut it on something solid.*

ڈاکٹر منظور احمد صاحب خالص عقائدی اور دین و قانون کی اساس پر استوار مسائل کو عقلی مابعد الطبیعیات اور فلسفیانہ (یعنی شک کے) نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں‘ یہی بات وہ تصوف کے بارے میں بھی لکھتے ہیں کہ:

> ’’میرا علم ان مضامین (یعنی تصوف وغیرہ) کے بارے میں فلسفے کے حوالے سے ہے اور ان مسائل کو میں اسی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں جس کو فلسفیانہ طریق کار کی روشنی میں صحیح سمجھتا ہوں۔‘‘

درحقیقت ڈاکٹر منظور احمد دین کے ہر عقائدی‘ احکامی وقانونی مسئلے بلکہ نفسِ دین تک کو‘ اس کے اپنے طریقِ تفہیم کی بجائے‘ فلسفیانہ جہت سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ خود یہ لکھ چکے ہیں:

> ’’روایت اور جدیدیت کے درمیان کوئی بامعنی مکالمہ ممکن نہیں‘ اس کا امکان صرف ایک تیسرے نقطہ نظر سے ہوسکتا ہے جو ان دونوں مفاہیم کو ایک معروض کی حیثیت سے دیکھ سکے اور پھر دونوں کا کچھ نہ کچھ ادراک حاصل کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں ان دونوں کی تفہیم کے لیے ایک تیسری کلامی منطق کی ضرورت ہوگی۔ اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی جدیدیت کے پیراڈائم سے روایت کے پیراڈائم میں منتقل ہو جائے یا روایت سے جدیدیت میں‘ اس طرح وہ پہلے پیراڈائم کو ماضی کی ایک غلطی سمجھ کر یاد رکھے۔ ان طریقوں کے علاوہ میری نظر میں کوئی اور طریقہ روایت اور جدیدیت کے مابین نزاع کی تفہیم کا ممکن نہیں۔‘‘

جب ڈاکٹر منظور احمد صاحب کو خود اس بات کا اعتراف وادراک ہے کہ روایت وجدیدیت کی اپنی اپنی کلامی منطق [جو اپنے طریق تفہیم اور نظام ہائے تصورات میں ایک دوسرے سے کلیتاً متخالف ومتغائر ہیں] سے بلند ہو کر ایک تیسری کلامی منطق کی دریافت کے بغیر دونوں نظاموں کے مابین نزاع کو ختم نہیں کیا جاسکتا‘ تو اس صورت میں جبکہ وہ علوم اسلامی پر سند یافتہ نہیں ہیں اور خود کو مغربی فلسفے کا پرداختہ اور مرہونِ کرم گردانتے ہیں —— وہ خود ہی غور فرمائیں کہ انہیں یہ استحقاق کیسے حاصل ہو گیا کہ روایت اور جدیدیت کے درمیان حَکَم اور ثالث بن کر فیصلے صادر کرنے لگیں؟ خصوصاً جبکہ وہ ’’علم تفسیر‘‘ کے نتیجہ خیز معیارات کو مغربی فکر سے مستعار قرار دیتے ہوں اور تصوف اور اس کی مابعد الطبیعیات جیسے روایتی مضامین کو فلسفیانہ طریق کار کی روشنی میں درست یا غلط سمجھنے کے عادی ہوں۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے فلسفیانہ افکار وخیالات کے مطالعے سے خلاّق بصیرت اور تخلیقی ذہانت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے سے موجود افکار ونظریات کے محض ناقل اور ترجمان نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر منظور صاحب کے اسلام‘ شریعتِ محمدیہ‘ مقاصدِ شریعت اور پاکستان کے بارے میں وہ خیالات و افکار جو انہوں نے جدیدیت اور سیکولرازم سے متاثر ہو کر تحریر کیے ہیں‘ کتابوں یا جریدوں کے علاوہ اخبارات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھی شائع ہوئے، جن کا نوٹس بعض دوسرے اصحابِ فکر کے علاوہ برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے بھی لیا اور یہ قسط وار ایک موقر اخبار میں چھپے۔ چنانچہ باوجود اختلاف کے، ڈاکٹر منظور صاحب اور اسرار بھائی میں پرانے تعلق کے بنا پر میل ملاقات رہتی تھی اور تبادلہ خیالات بھی ہوتا تھا۔ میرے سامنے اس وقت ڈاکٹر منظور صاحب کا 13/اگست 2002ء کا لیٹر ہیڈ پر محررہ خط ہے جو ڈاکٹر اسرار صاحب اور مجھے ارسال کیا گیا تھا۔ ان کے ہاں ماہانہ فکری نشست ہوتی تھی (نمعلوم اس کی کیفیت اب کیا ہے)۔ اس دعوت نامے میں ان کے 'ڈان' کے 23 جولائی (2002) میں شائع ہونے والے مضمون A Closed mind کی عکسی نقل لف تھی اور ساتھ ہی 'ڈان' ہی میں شائع ہونے والے ایک تائیدی خط کی نقل بھی۔ یہ مختصر خط پروفیسر زبیر بن عمر کا تھا۔ اتوار 25/اگست کو اس موضوع پر تبادلہ خیال کے لیے گھر پر نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دو ایک مرتبہ اسرار بھائی کے خیالات جاننے اور ان پر نقد و تبصرہ کے لیے انہیں پوری نشست کے لیے مقرر کے طور پر بھی مدعو کیا گیا۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ کئی سال ماہانہ ہونے والی ان علمی محافل کے حاصلات کیا رہے، اور کیا زبیر بن عمر صاحب نے ان کی تدوین اور انضباط کے بعد ان کو تحریری شکل دے کر شائع کیا یا نہیں۔

محولہ بالا 'ڈان' میں شائع ہونے والے مضمون کا عنوان ہی بتا رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک راسخ العقیدہ مسلمان کو بالکل dogmatic اور بند 'ذہن' سمجھتے ہیں جس میں ''روشنی'' کا گزر قطعاً نہیں ہے، اس کے عقائد اندھے، بہرے، غیر منطقی اور ہر قسم کی عقلیت سے بے بہرہ ہیں۔ فلسفے سے واقف قارئین کے ذہن میں کارل پوپر کی کتاب کا ٹائٹل آ جانا چاہیے "The Open Society and its Enemies"۔ مشمولہ کے اعتبار سے دونوں میں مماثلت بھی ظاہر و باہر ہے۔ زیادہ تفصیل کی یہ تحریر متحمل نہیں ہو سکتی۔ مختصراً منظور صاحب اسلام کی متواتر روایتی تفہیم کو ''فقہی اسلام'' سے تعبیر فرماتے ہیں، جسے ان کے خیال میں اصول نہیں بنانا چاہیے، لکھتے ہیں:

> ''زندگی کے منجملہ معاملات کو نبٹانے کے لیے قدماء کی آراء اور فیصلے مدد و معاون تو ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن ان کو حتمی اصول بنا کر ان سے استخراج کو ایک نا قابلِ تردید حقیقت سمجھنا ممکن نہیں''۔ (مشمولہ سہ ماہی المعارف ''نیاز، روشن خیالی......)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''وہ فکری بنیاد جس پر معاشی ترقی، تصوراتی ارتقاء اور تکنیکی ترقی ممکن ہے...... یہ ہے کہ قرآن کریم اور سنت کے روایتی خوشہ چینی طریق کار کو چھوڑ کر اس پر نئے سرے سے نظر ڈالی جائے''۔ (عصرِ حاضر میں اسلام کی تفہیم، مشمولہ اسلام، چند فکری مسائل، ص ۶۸)

فقہاء اور قدماء کی منصوص و متفقہ آراء کے برعکس ان سطور سے ڈاکٹر منظور احمد صاحب قرآن و سنت ہی کو حتمی اصول مان کر اس سے استخراج کو واضح طور پر اسلامی شریعت کے منافی رویہ سمجھتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے نیاز فتح پوری جیسے پراگندہ اور باطل خیال شخص کو جدید اسلام کا ''روشن خیال ذہن'' اور چہرہ قرار دے کر دین متین کی کوئی مثبت خدمت سرانجام دی ہے یا بہت سے ژولیدہ فکر کے حامل دانشوروں کی آواز میں آواز ملائی ہے، جن کی فہرست اگرچہ طویل ہے لیکن ان میں چند نمایاں ہیں، مثلاً پروفیسر محمد ارکون، ڈاکٹر طارق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رمضان، راشد شاذ، ضیاء الدین سردار وغیرہ۔ میرے خیال میں ڈاکٹر منظور بالعموم شک و ارتیاب اور uncertainty کو منہاجیات اور فلسفے میں بنیادی اہمیت دیتے ہوئے برٹرینڈ رسل کے لبرل ازم کے اصول عشرہ (A liberal decalogue) کے قائل نظر آتے ہیں۔

جدیدیت کا سنڈروم گزشتہ چھ سات دہائیوں کے دوران عالمی سطح پر اسلام کے حوالے سے متعدد شناختی عنوانات (Labels/adjectives) کے ساتھ استعمال ہوا ہے، مثلاً لبرل اسلام، موڈریٹ اسلام، روشن خیال (enlightened) اسلام، ریفارمسٹ اسلام، پولیٹیکل اسلام وغیرہ۔ اسلام کو اس صورت میں پیش کرنے والوں میں ایک نام ضیاء الدین سردار پچھلے آٹھ دس برسوں سے اپنے آپ کو اور اپنے ہم خیال حلقے کو کریٹیکل مسلمان (The Critical Muslim) کا لیبل اور اسلام کا وہ version پیش کر رہے ہیں کہ بقول شاعر ع ''کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی''۔ سردار فکری طور پر تحولِ عظیم سے گزر کر اب وہ نہیں رہے جو وہ Afkar/Enquiry کے زمانے میں تھے۔ کریٹیکل مسلم کی حیثیت سے بغیر ضروری تیاری کے بزعم خویش مفسرِ قرآن، شارحِ شریعت اور مجتہد سبھی کچھ ہیں اور الٹرا جدیدیت کی راہ پر بگٹٹ رواں دواں ہیں۔ اڑھائی تین ماہ قبل انہیں اکتیس سال بعد (پہلی ملاقات شکاگو کے ہالیڈے اِن میں ایک ڈنر کے موقع پر 1984ء میں ہوئی تھی) جب لاہور لٹریچر فیسٹیول میں ڈاکٹر ہود بھائی کے ساتھ مکالمہ کرتے دیکھا، تو بہت قلق اور حیرت و مایوسی اس اعتبار سے ہوئی کہ عالمی شہرت کے مسلم دانشور ڈریس اور صحت کے اعتبار سے ناگفتہ بہ حالت میں تھے۔

اس تحریر کا اختتام اپنے چند تاثرات کے مختصر بیان پر کروں گا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ پاکستانی جامعات اور دانش گاہوں کے فاضلین اور پروفیسر حضرات اسلام سے معمولی سا جذباتی تعلق تو رکھتے ہیں، لیکن بالعموم قرآن وسنت اور دینی علمی و عرفانی روایت کا علم نہیں رکھتے اور اسلاف کی شاندار اور انتہائی بصیرت افروز تحریروں سے بالکل ناواقف ہیں۔ جبکہ مغربی دنیا میں ہمیں کئی ایسے فلسفی اور مفکر ملتے ہیں جو اپنی دواڑھائی ہزار سالہ تہذیبی تاریخ اور اس کی علمی روایت کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اپنی فکری کاوشوں میں ان کا حوالہ دینے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان حوالوں سے وہ اپنے خیالات کو زیادہ مثبت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں السیڈ یئر میکنٹائر اور چارلس ٹیلر اور بعض دوسرے دانشور سرفہرست ہیں۔ ان جیسی جامعیت، علمی بصیرت اور گہرا تاریخی شعور رکھنے والے اساتذہ اور لکھنے والے ہمارے ہاں سوائے چند کے عنقا ہیں۔

راقم کو مذکورہ مفصل کتاب کے مندرجات اور سہ ماہی 'جی' کے گزشتہ شمارے میں مدیر جناب محمد دین جوہر کی بعض تحریروں بالخصوص ''دینِ حق کی جدید تعبیرات'' میں گہرا توارد نظر آتا ہے، جو اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن گہرائی اور معنویت کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر منظور صاحب کے حوالے سے بدقسمتی کا معاملہ ایک یہ بھی ہوا کہ وہ کراچی یونیورسٹی میں لندن جانے سے پہلے ذہین شاہ تاجی سے تو متعارف کرائے گئے لیکن شاید مولانا محمد ایوب دہلویؒ کی انتہائی غامض دینی اور منطقی گفتگوؤں سے استفادہ نہ کر سکے۔ جدیدیت اور سیکولر فکر کے زیر اثر پروفیسر منظور صاحب، غامدی صاحب اور دوسرے ہم خیال اصحابِ دانش کے بارے میں جوہر صاحب نے کیا خوب لکھا ہے: ''جو دینی فکر اب تداول کا درجہ اختیار کر چکی ہے اس کا مسئلہ یہی ہے کہ ایک دن 'فکر' کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جھنجھنا ہاتھ میں رہ جاتا ہے اور دین رخصت ہو جاتا ہے''۔ وہ بالکل بجا طور پر عصرِ حاضر میں دینی فکر کو آشفتگی کا شکار خیال کرتے ہیں اور ایک مضبوط فکری حصار کو دین کے لیے ازبس ضروری قرار دیتے ہیں۔ تاہم میں بصد ادب گزارش کرنا چاہوں گا کہ مضبوط فکری حصار کہیں خلا میں معرضِ وجود میں نہیں آتا' بلکہ دین سے کمٹمنٹ رکھنے والے ہم خیال اور عملی طور پر پروا یکٹو اصحاب کی جمعیت کا متقاضی ہے۔ جوہر صاحب کا یہ جملہ ''دین میں حضور ﷺ کی مرکزیت کو مشتبہ بنائے بغیر جدید دینی تعبیر کے کام کا آغاز بھی نہیں ہو سکتا''، جدیدیت کے اسیر حضرات کی سو فیصد صحیح نباضی کرتا ہے۔ لیکن اس کا علاج صرف 'ارزانی سخن' سے ممکن نہیں بلکہ خواص اور عوام دونوں کی سطح پر سنت رسول ﷺ کی شرعی حجیت' عمل میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اس کو اپنانے اور رسالت کے مشن کی عالمی لیول پر تکمیل کے لیے جدوجہد میں ہے۔

جدیدیت اور سیکولر فکر کا اسلام کے روایتی فکر سے جو قرآن وسنت اور قرنِ اوّل کے اصحابِ علم وتقویٰ کے اقوال واعمال کا تسلسل ہے' جوہری فرق ہے۔ 'روایت' (tradition) کا لفظ ایک دوسرے محدود معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے' جو شوآن' حسین نصر اور دوسرے متصوفین کی نگارشات میں ملتا ہے۔ یہ حضرات صرف فرد کی ذاتی اصلاح اور روحانی بالیدگی پر اپنا فکر مرکوز رکھتے ہیں' اور اس طرح مابعد جدیدیت کی مذہب کی وہ تعریف قبول کر لیتے ہیں جس میں مذہب کو فرد کے باطنی اطمینان اور آسودگی تک محدود کر کے اسلام کے اجتماعی نظم اور ہیئت سیاسی سے قطعاً اعتناء نہیں کیا جاتا' چنانچہ عالمی سیاسی وتہذیبی سطح پر یہ لوگ اسلام کو ایک بالکل غیر مؤثر اور انتہائی محدود تناظر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جبکہ راسخ العقیدہ اور بالغ نظر علمائے حقانی نے اسلام کو بحیثیت دین جو فرد اور اجتماع (polity) دونوں کو راہنمائی وہدایت دیتا ہے' اپنی کلیت میں پیش کیا ہے اور روایت کو بلا استثناء ٹھیٹھ فقہی معنی میں لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پس جدیدیت کے افکار نے اور اس لٹریچر نے جو مغرب میں خود مغربی زبانوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے زیر اثر ہونے والی تہذیبی اور تمدنی خرابیوں کے بارے شائع ہوا ہے' گزشتہ صدی کے وسط تک قائم سائنسی / سیکولر سوچ کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اور اب مغرب ہی میں متعدد نو مسلم حضرات اسلام کے بنیادی مصادر اور مراجع کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کر کے دینِ متین کی حقانیت کو بلند ترین علمی سطح پر پیش کر رہے ہیں' گویا بقول علامہ اقبال: ع پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔

آخر میں 'الدِّین النَّصیحَۃ' کی سپرٹ میں میری دعا اور دلی تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر منظور احمد صاحب کو توفیق اور ہمت ارزانی کریں کہ وہ اپنے خیالاتِ باطلہ کے حوالے سے اعلانِ براءت اور اظہارِ تقصیر کر کے اپنی عاقبت سنوار لیں۔ آمین!

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع!

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لیے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (III,II,I)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لیے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی، 36۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-35869501

Email: distancelearning@tanzeem.org

© rasailojaraid.com